بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت شمس العلماء مولانا عبد الحقؒ

مفسّر تفسیرِ حقّانی کی زندگی کے جستہ جستہ حالات

از حکیم محمد اسحاق حقّانیؒ

بہ اہتمام: ملا اویس نمازی ندوی (لندن)

قبل اس کے کہ میں حضرت قبلہ شمس العلماء مولانا ابو محمد عبد الحق محدّث ومفسّر تفسیرِ حقّانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی اور آپ کی دینی و ملی خدمات پر قلم اٹھاؤں یہ عرض کردوں کہ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اپنے فرض میں کوتاہی برتی اور آج تک یہ احساس نہ ہوا کہ جس ہستی نے میری پرورش کی، تعلیم وتربیت دی، اور جن کی نسبت و نام سے دنیا میں متعارف ہوا، ان کی زندگی کے اہم واقعات اور وہ قومی و ملّی خدمات جو مشعلِ راہ بنانے کے قابل ہیں، قوم کے سامنے پیش کرتا۔

پھر ایسی حالت میں کہ آپ کے فرزندانِ گرامی: مولانا عبد القیوم، مولانا ابو الحسن، مولانا ابو الخیر رحمھم اللہ تعالیٰ بھی اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں، میری یہ غفلت اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔

اور اس لئے بھی کہ میرے والدین کا انتقال میری خورد سالی میں ہو گیا تھا، میرا دنیا میں کوئی سہارا نہ تھا۔ یہ ہی برگزیدہ ہستی تھی کہ جس نے مجھے سرپرستی میں لے کر اس طرح پرورش و تعلیم و تربیت کا حق ادا کیا کہ سوائے خاندان کے چند افراد کے، کسی کو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ یہ بدنام کنندہ حضرت علامہ حقّانیؒ کا فرزند نہیں، بلکہ برادر زادہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت کی حیات میں مجھے خود بھی یہ احساس نہیں ہوا، چنانچہ عام دہلی والے مجھے مولاناؒ کا فرزند ہی سمجھتے رہے اور سمجھتے ہیں۔

اس حقیقت کے واضح کر دینے کے بعد یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میں اس فرض کو ایسے ہی نا مساعد وقت میں انجام دینے پر آمادہ ہوا ہوں کہ حضرت کے حالاتِ زندگی لکھنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت تھی ان سے محروم ہوں۔ یہ کام مجھے تقسیمِ ہند سے بہت پہلے کر لینا چاہئے تھا، جیسا کہ میرے پاس اس سلسلہ کا تمام مواد موجود تھا۔ اب جو کچھ میں قلمبند کر رہا ہوں اس کی بنیاد مولانا جان محمد عارف مرحوم مغفور کی وہ کشکول ہے جس میں آپ کے مختلف نوٹ ہیں۔

مولانا جان محمد عارف خدا ان کو غریقِ رحمت فرمائے، میرے شفیق استاد تھے، جن سے میں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، اور جو حضرت قبلہ مولانا حقّانیؒ کے ایسے شاگردِ رشید تھے جو سفر و حضر میں کامل تیس (۳۰) سال تک حضرت کی خدمت میں رہے۔

جب کبھی حضرت قبلہؒ اپنی زندگی میں کچھ حالات بیان فرماتے تو مولانا جان محمدؒ اپنی کاپی میں درج کر لیا کرتے تھے، جس پر کشکولِ جان محمد تحریر ہے۔ اس سے ان کی یہ غرض تھی کہ کسی وقت ان حالات کو ترتیب دے کر سوانح کی شکل دی جا سکے۔ حضرت قبلہؒ کی وفات کے بعد آپ کے منجھلے فرزند مولانا ابو الحسن حقّانیؒ طویل علالت میں مبتلا ہو گئے، جن کو مولانا جان محمدؒ اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ مولانا ابو الحسنؒ کے انتقال کے بعد مولانا جان محمدؒ خود طویل علالت میں مبتلا ہو گئے اور وہ اس خدمت کو انجام نہ دے سکے۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو میں اجمیر شریف میں تھا، کہ مجھے مولانا موصوفؒ کا دہلی سے ایک کارڈ موصول ہوا، جس میں تحریر تھا "میرے بچاس سالہ رفیق، میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں، صرف تم کو دیکھنے کی آرزو ہے، فوراً چلے آؤ۔ جان محمد۔ ۱۲/ ستمبر سنہ ۴۵ء"

اس کارڈ کے دیکھتے ہی میں دہلی پہونچا اور اپنے شفیق استاد کی قدم بوسی حاصل کی۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے فرمایا کہ الماری سے میری کشکول نکال لو، میں نے وہ کاپی نکالی تو فرمایا کہ اس کا آخری صفحہ نکال کر پڑھو۔ تحریر تھا:

"افسوس میں حیاتِ حقّانی نہ لکھ سکا۔ اب اس خدمت کو حکیم محمد اسحاق سلّمہ انجام دیں"

۳/ اگست سنہ ۴۴ء

میں نے عرض کیا ان شاء اللہ آپ کے ارشاد کی تعمیل کروں گا۔ اس واقعہ کے چار روز بعد ہی مولانا موصوف کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مگر افسوس کہ اس واقعہ کو بھی ۱۷ سال گزر گئے، بارہا ارادہ کیا مگر نا مساعد حالات کی بنا پر کچھ نہ کر سکا۔ اس عرصہ میں ہند و پاکستان کی تقسیم بھی ہو گئی اور میں ہنگامی حالات میں کراچی چلا آیا۔

یہاں آنے کے بعد بھی سکون میسّر نہ ہو سکا۔ اب جب کہ میں خود چراغِ سحری ہوں، عمر کے پچھتّر (۷۵) سال سے زائد گزر چکے ہیں، عزیز القدر میجر سلیم حقّانی ایڈوکیٹ نبیرۂ حضرت مولانا حقّانی رحمت اللہ علیہ نے زور دیا کہ آپ حیاتِ حقّانی اس نظریہ کے تحت لکھ دیجئے کہ حضرت قبلہؒ کی تصانیف کے ساتھ لگا دی جائے تاکہ قارئین کرام حضرت مولانا حقّانیؒ کے حالاتِ زندگی اور ان کی ملّی خدمات سے بھی استفادہ حاصل کر سکیں۔ اُس وقت مولانا قاضی عبد الرحمن صاحبؒ عقائد الاسلام طبع کر رہے تھے، اس میں شامل کی جا سکے۔ اس لئے اس پیرانِ سالی میں جستہ جستہ حالات قلمبند کئے گئے۔ وما توفیقی الا باللہ۔ الحمد للہ کہ اس کی توفیق اور کرم سے یہ خدمت انجام پا گئی۔

[سلسلۂ نسب] آپ کا سلسلہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے منجھلے فرزند سیدنا عباسؓ سے ملتا ہے، جو ام البنین بنت حزام کے بطن سے ہیں۔ یوں تو خلفائے راشدین و صحابہ

رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں بھی ان بزرگوں کی اولاد، بلکہ بعض صحابہ تابعین وتبعِ تابعین اور ان کی اولاد و احفاد دور دراز ملکوں میں پھیل گئے تھے۔ مثلاً سیدنا ابی کبشہؓ[1] صحابیِ رسولؐ چین تشریف لے گئے، عبد الرحمن تمیمی انصاریؒ اطرافِ مالابار میں، اسی طرح تبعِ تابعین کا جزائرِ شرقیہ میں سکونت پذیر ہونا، کتبِ سیر و تواریخ سے ثابت ہے۔ کچھ حضرات شام، عراق، بغداد، حبشہ اور ایران میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، جن کا مطمحِ نظر صرف خدمتِ خلقِ اللہ اور تبلیغ و اشاعتِ اسلام تھا، جنہوں نے اپنی روحانی قوت اور اخلاق سے لاکھوں افراد کو جو ضلالت اور گمراہی کے گڑھے میں پڑے ہوئے تھے، مطیع اور اسلام کا فدائی بنایا اور ایک عالَم کو منوّر کر دیا۔

ان ہی نفوسِ قدسیہ کی اسلامی خدمات کے اثرات ہیں، تا این دم ہند و چین وغیرہ ممالک میں کروڑہا مسلمان موجود ہیں، جو ببانگِ دہل خدائے وحدہ لا شریک لہ کی تقدیس و تہلیل کر رہے ہیں۔

اسی طرح سیدنا عباس ابن علی کرم اللہ وجہہ کے ابناء مختلف ممالک میں پھیل گئے ہیں۔ چنانچہ شیخ ہادی علویؒ فارس اور نواحِ اردبیل میں، خواجہ شرف الدین احمد علویؒ قزوین میں، نور الدین قاسم علویؒ تبریز میں سکونت پذیر تھے۔ ان کی تیسری پشت خواجہ شاہ نظام الدین محمد علویؒ تبریزی جن کے علومِ معقول و منقول کا ڈنکا ملکِ ایران وغیرہ میں بج رہا تھا، ان کے پوتے خواجہ مظفر الدین علوی بن شاہ محمد تبریزیؒ اس خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو بسببِ تعصبِ سلاطینِ صفویہ بعدِ فراغتِ حجِ بیت اللہ و زیارتِ روضۂ رسول ﷺ بحکمِ (**سیروا في الارض**) ہندوستان تشریف فرما ہوئے۔

سندھ و ملتان وغیرہ ہوتے ہوئے بعہدِ خلیفہ المسلمین محیی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ بادشاہ غازی، دہلی شاہجہاں آباد تشریف لے آئے اور دہلیِ کہنہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔

---

[1] اس طرح متن میں ہے ، مگر یہاں صحیح (ابن ابی کبشہ) ہونا چاہئے۔

جب آپ کی تشریف آوری کی اطلاع علمائے عہد کو ہوئی تو آپ کا پُرجوش و پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پھر کیا تھا؟ علماء و امراء، مشائخ و طلباء کا آپ کے در پر جمگھٹا رہنے لگا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دربارِ شاہی میں طلبی ہوئی اور منصب و خلعتِ خاصہ سے سرفراز کئے گئے اور مسندِ صدارت دار الافتاء آپ کو تفویض کی گئی۔ خود حضرت مولانا نے مقدمۂ تفسیرِ حقّانی کے صفحہ ۱۵۲ پر سر سیّد احمد خان کی تفسیر القرآن کا ذکر کرنے کے بعد اپنے نسب کے متعلق تحریر فرمایا ہے:۔

”فتح المنان، تفسیر القرآن، مشہور بہ تفسیرِ حقّانی، اس بیوقوف کم استعداد ابو محمد عبد الحق بن محمد امیر بن شمس الدین بن نور الدین بن خواجہ جعفر بن خواجہ سلیم بن مظفر الدین بن شاہ محمد تبریزی کی تصنیف ہے۔“

عہدِ شاہ عالم تک مولانا کے بزرگ دہلی میں اعلٰی مناصب پر فائز رہے اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہمارا مکان دہلی میں لال ڈگی کے قریب ”باب الاسلام“ کے نام سے مشہور تھا، جس میں ایک طرف دار الحدیث اور ایک طرف دار الاقامہ بھی تھا۔ ہمارے خاندان کے بیشتر افراد اسی میں رہا کرتے تھے۔

ہنگامۂ دہلی سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد لال ڈگی اور جملہ شہزادگان کے مکانات کو مسمار کر کے میدان بنا دیا گیا، جو اب ”پریڈ کے میدان“ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ”باب الاسلام“ بھی مسمار ہو گیا، اور ہمارے خاندان کے لوگ منتشر ہو گئے۔

[ریاستِ کیتھل Kaithal کی سکونت] مولانا کے بزرگوں نے ریاستِ کیتھل کی سکونت کیوں اور کیسے اختیار کی، اس کا باعث یہ ہوا کہ راجہ لال سنگھ والئ کیتھل بہ زمانۂ ولئ عہدی قلعۂ معلی میں شاہ عالم بادشاہِ دہلی کے ظلِ عاطفت میں پرورش پا رہے تھے، سنِ بلوغ کو پہنچے تو ان کو سند اور فرمانِ راجائی مرحمت ہوا۔ اسی وقت حسبِ ذیل فرمانِ شاہی وسندِ دیوانی ریاستِ کیتھل بنامِ خواجہ شمس الدین لعل محمد خان ابن خواجہ نور الدین خانؒ صادر ہوا:۔

”حسب الحکم جہان مطاع رفعت دعوی بی پناہ خواجہ شمس الدین لعل محمد خان مورد مراسم باد.

اعلام آنکہ خدمت دیوانی راجہ لعل سنگھ والی کیتھل بشما مفوض گشتہ است، خود را آنجا رسانیدہ خدمتِ دیوانی باسلوب انجامند“

چنانچہ خواجہ لعل محمد خانؒ نے اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت سے ریاست کے بگڑے ہوئے نظام کو جس میں خانگی تنازعات، باہمی کشیدگی اور ریاست کی افراتفری شامل تھی، درست کر کے ریاست کے وقار کو بحال کر دیا، جس کی وجہ سے راجہ لعل سنگھ والئ کیتھل آپ کی بے حد عزت کرتے تھے اور ریاست کا کوئی کام بغیر استمزاج نہ کرتے تھے۔

خواجہ لعل محمد خانؒ کے بعد ان کے فرزند محمد امیر خانؒ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے اور امورِ ریاست باحسن الوجوہ انجام دیتے رہے کہ سنہ ۱۸۵۱ء میں راجہ لعل سنگھ کے فرزند اودھے سنگھ (Udey Singh) جو اس وقت ریاست کے فرمانروا تھے لا ولد فوت ہو گئے۔

رانی صاحبہ اپنے برادر زادہ کو گدی نشین کرنا چاہتی تھیں۔ جب تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور گدی نشینی کی رسم ادا ہو رہی تھی کہ اس وقت یکایک سکھوں کے ایک بڑے گروہ نے حملہ کر کے رانی کے اس برادر زادے کو قتل کر دیا۔ مفسدہ پرداز سکھ رانی صاحبہ کو بھی گزند پہونچانا چاہتے تھے، اس لئے امیر محمد خانؒ رانی صاحبہ کو ساتھ لے کر لڑتے بِھڑتے قلعۂ پہیوا (Pehowa) میں لے آئے، جو کیتھل سے ۲۳ میل جانبِ مشرق سرسوتی ندی کے کنارے واقع ہے اور ہندوؤں کی بڑی تیرتھ گاہ ہے۔[2]

[2] آج تک باقی ہے اور (Saraswati Teerth) سے معروف ہے۔

سکھوں نے یہاں آکر بھی قلعہ کو گھیر لیا، محمد امیر خانؒ نے قصبۂ گمتھلہ (Gumthala) کے مسلم راجپوتوں سے امداد چاہی، اس قصبہ کے سردار رانا بہادر علی خانؒ قرب و جوار کے کئی ہزار راجپوتوں کو لے کر پہیوا پہنچ گئے اور مفسدہ پرداز سکھوں کو ان کے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

اس اثنا میں کرنال چھاؤنی (Karnal) سے انگریزوں کی فوج آگئی اور تمام ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ رانی صاحبہ کو پرگنہ ارنولی (Pargana Arnoli) جو ان کا میکہ تھا پہنچا دیا گیا۔ یہ پرگنہ رانی صاحبہ کو واگذاشت ہوا اور ایک چھوٹی سی ریاست بن گئی، جو تقسیمِ ہند تک قائم رہی اور امیر محمد خانؒ کی مددِ معاش کے لئے تین گاؤں فرس چاجرا،[3] خنجر پور اور عثمان پور دیئے گئے۔

چونکہ سکھ امیر محمد خانؒ کے دشمن ہو گئے تھے، اس لئے بہادر راجپوت ان کو گمتھیلہ گڈھ (Gumthala Garhu) رانا بہاؤ الدین جو قلعۂ پیہوا سے تین میل کے فاصلہ پر تھا لے آئے۔ یہ قصبہ گمتھلہ گڈھ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ قصبہ ان بہادر اور شریف راجپوتوں کی بستی ہے جن کے جدِ اعلی رانا بہاؤ الدین بعہد دولتِ فیروز شاہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ رانا بہاؤ الدین تنور راچپوت تھے اور راجہ جے پال والئ دہلی کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد جو بہادریاں اور کارہائے نمایاں جنگی مواقع پر رانا بہاؤ الدین نے دکھائے وہ تاریخ سے بخوبی واضح ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد رانا بہادر علی خانؒ کی دخترِ نیک اختر سے خواجہ محمد امیر خانؒ کی شادی ہو گئی اور مستقل سکونت اسی قصبہ میں اختیار کر لی، اور وسطِ قصبہ میں ایک بہت بڑی حویلی تعمیر کرائی جس کو ایک چھوٹا سا قلعہ کہا جاسکتا ہے، اور جو

---

[3] نقشہ پر غور کرنے سے یہ بظاہر (فرش ماجرا) Farsh Majra کی تصحیف ہے۔ واللہ اعلم۔ ورنہ یہ جگہ اور اس کے نام کی صحیح ضبط محلِ غور اور قابلِ تحقیق ہے۔

فنِ تعمیر کے لحاظ سے بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جس کو دیکھنے کے لئے اکثر انجنیئر آیا کرتے تھے۔

تقسیمِ ہند کے بعد اس قصبہ کے تمام مسلمان پاکستان آگئے اور یہ حویلی ایک سکھ رئیس کو الاٹ ہو گئی۔

[ولادت اور ابتدائی تعلیم] مولانا عبد الحق حقّانیؒ اسی قصبہ گمتھلہ گڈھ (رانا بہاؤ الدین) میں ۲۷ رجب سنہ ۱۲۶۵ھ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ والدین اور اہلِ قصبہ حضرت میران شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے اِن کے خلیفہ اور سجّادہ نشین حضرت مولانا سید شاہ عبد الحمید عرف عبد اللہ شاہؒ بڑے باخدا بزرگ تھے اور قصبہ میں ایک خانقاہ تھی جس میں بیشتر اقامت فرماتے تھے۔

مولانا حقّانیؒ کو شاہ موصوف کے کنارِ عاطفت میں دے دیا گیا۔ گویا حضرت شاہ صاحبؒ ہی نے پرورش کیا۔ بسم اللہ خوانی کے بعد کلامِ ربانی اور ابتدائی کتب، اردو، فارسی، صرف ونحو وغیرہ خود شاہ صاحب نے پڑھائیں۔

سنہ ۱۲۷۷ھ میں جب آپ کی عمر بارہ (۱۲) سال تھی شاہ صاحبؒ کی ہدایت کے مطابق مولاناؒ کو تحصیلِ علم کے لئے دہلی حضرت آخوند شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی خدمت میں بھیجنا تجویز ہوا۔ مولاناؒ کی پیدائش سے پہلے کئی بچے فوت ہو چکے تھے اور آپ کے بھائیوں کے نام غلام نبی اور غلام حسین تھے۔ ان ناموں کی مناسبت سے مولاناؒ کا نام غلام جہاں رکھا گیا تھا۔ جب تعلیم کے لئے آپ کو دہلی بھیجا جا رہا تھا تو آپ نے اپنے شفیق استاد حضرت عبد اللہ شاہؒ سے عرض کیا کہ میرا نام غلام جہاں رکھا گیا ہے جو مجھے پسند نہیں، میں چاہتا ہوں کہ میرا نام تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ نے آپ کا نام عبد الحق رکھا۔

آخوند عبد العزیز صاحبؒ کے مولانا کے والد خواجہ محمد امیر اور اہلِ قصبہ سے خاص تعلقات تھے اور ہنگامۂ دہلی سنہ ۱۸۵۷ء میں آخوند صاحب اسی قصبہ میں خواجہ محمد امیر صاحب کے مکان میں رہ چکے تھے۔

جب مولانا حقّانیؒ کو آخوند صاحب کی خدمت میں بھیجا گیا تو ان تعلقات کی بنا پر آپ نے بڑی شفقت سے اپنے پاس رکھا اور کتبِ درسیہ پڑھائیں۔

[تحصیلِ علم کیلئے مولانا کا سفر] آخوند صاحبؒ کی اجازت سے مولانا سہارنپور تشریف لے گئے اور شیخ الحدیث مولانا احمد علیؒ کی خدمت میں رہ کر تحصیلِ علم کی۔ ازاں بعد آپ نے کانپور حضرت شیخ عبد الحق قادری مہاجرِ مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر تحصیلِ علم اور فیوض و برکات سے استفادہ حاصل کیا۔ حضرت شیخ نے مولانا کی قابلیت اور زہد و اتقا دیکھ کر سند کے ساتھ خلافت در سلسلۂ قادریہ بھی عطا فرمائی۔

وہاں سے رخصت ہو کر آپ جونپور تشریف لے گئے اور مختلف اساتذہ سے پڑھ کر علومِ معقول و منقول کی تکمیل کی۔ ازاں بعد مع اپنے رفقائے درس مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا احمد حسن کانپوریؒ، مولانا آل حسن صاحب مودودی امروہیؒ بغرضِ حصولِ حدیثِ نبوی، مرادآباد حضرت شیخ المحدثین عالم علی شاہ رحمت اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاقِ زمانہ اس وقت شیخ المحدثین سخت علیل تھے، اس لئے چند روز وہاں قیام کے بعد علی گڑھ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی لطف اللہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کامل دو سال رہ کر تعلیم حاصل کی اور وہاں سے دہلی تشریف لے گئے۔

[مراجعتِ وطن] سنہ ۱۲۸۸ھ میں والدینؒ اور حضرت عبد اللہ شاہ صاحبؒ کی قدم بوسی کا شوق آپ کو گمتھلہ گڑھ لے گیا۔ والدین اور حضرت شاہ صاحب کی قدم بوسی سے مشرّف ہوئے۔ گیارہ سال کی جدائی کے بعد فارغ التحصیل ہو کر مولانا کا وطن واپس

پہنچنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ والدین اور حضرت شاہ صاحب کے علاوہ تمام قصبہ میں بھی خوشی وانبساط کی لہر دوڑ گئی، ہر شخص ملنے اور دیکھنے کے لئے دوڑا چلا آتا تھا، گویا ؎

یوسف گم گشتہ بہ کنعان آمد

حضرت شاہ صاحب اور والدین خوشی کے مارے جامے میں نہ سماتے تھے۔ شاہ صاحب موصوف نے اطراف و اکناف کے علماء و مشایخ کو مدعو کر کے جلسہ کیا، جس میں مولانا حقّانیؒ سے چند علمی سوالات کئے گئے۔ مولانا نے جس انداز میں جواب دئے اس سے علماء و مشائخ پر ایک خاص اثر ہوا۔ حضرت شاہ صاحب نے اس جلسے میں مولانا کو فرقِ[4] مبارک پر اپنے مقدس اور پاک ہاتھوں سے دستارِ فضیلت باندھی جو اب تک بطورِ تبرک ہمارے پاس موجود ہے۔[5] اس جلسے میں حضرت شاہ صاحب نے ایک قطعۂ تاریخِ فراغتِ علمی بھی تحریر فرمایا، جو درجِ ذیل ہے:۔

عبد الحق از علوم برے خورد و گل بچیند　　　دادش سپر مژدہ دلش باغ باغ باد

چون کرد فکر سال تمام فضیلتش　　　ھاتف دعا بگفت و دو لفظ فراغ باد

اس کے بعد مولانا سنہ ۱۲۸۸ھ میں والدین اور حضرت شاہ صاحب سے رخصت ہو کر دہلی تشریف لائے اور وہاں سے حضرت شیخ العلماء مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقریبا ایک سال خدمت میں رہ کر علومِ طریقت کی تکمیل کی اور خرقۂ خلافت حاصل کر کے دہلی آئے اور شیخ الحدیث مولانا

---

4 واضح طور پر اصل متن میں حرف فے ہے، جس سے سر اور ماتھا مراد ہے۔ البتہ آگے متن میں جہاں خرقہ مبارک کا ذکر ہے وہاں خرقہ کو واضح طور پر قے کے ساتھ لکھا ہے۔ اس لئے احتمال ہے کہ یہاں بھی خرقہ مراد ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

5 عقائد الاسلام کے ایک اور اڈیشن میں اس طرح ترمیم و اضافہ ہے: حضرت شاہ صاحب نے اس جلسے میں مولانا کے فرق مبارک پر اپنے مقدس اور پاک ہاتھوں سے دستار فضیلت باندھی جو اب تک بطور تبرک مفتی عبدالقدوس ترمذی، مہتمم جامعہ حقّانیہ ساہیوال، سرگودھا کے پاس موجود ہے۔ ۱۲

سید شاہ نذیر حسین صاحب حسنی حسینی رحمۃ اللہ علیہ والغفران کی خدمتِ بابرکت میں رہ کر حدیثِ نبویؐ کی قرآءت اور سماع مختصر فرمائی۔

کتبِ حدیث تحقیق وتدقیق کی نظر سے لفظاً لفظاً شیخ الحدیث کے سامنے قرآءت کیں۔ مولانا حقّانی کی خداداد قابلیت و ذہانت کی وجہ سے حضرت شیخ الحدیث غایت درجہ آپ پر شفقت فرمایا کرتے تھے۔ جب طلباء سے دورانِ درس مسائلِ فقہ وغیرہ میں گفتگو ہوتی تھی تو حضرت شیخ المحدثین فرمایا کرتے تھے "ذرا توقف کرو، حنفیوں کا شیر عبد الحق آتا ہوگا، وہ تمہارا جواب دیگا۔" مولانا کو دیکھتے ہی خاص انداز میں فرماتے "آؤ جان عبد الحق، تمہارے ان بھائیوں کو چند مقامات پر شبہ ہو گیا ہے، ہمارے سامنے ان کا جواب دو۔"

شیخ الحدیث نے مولانا حقّانی کو اجازتِ مطلق اور سندِ موثق عطا فرمائی، جس کی نقل درجِ ذیل ہے:

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله ربّ العالمين، والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين. أما بعد: فيقول العبد الضعيف، طالب المحسنين، محمد نذير حسين، عافاه الله في الدارين، إن المولوي محمد عبد الحق ... إلى آخره. ١٢ شعبان المعظم سنة ١٢٩٠هـ

[مدرسی جامعہ اسلامیہ فتح پوری] شعبان سنہ ۱۲۹۰ھ ہی میں آپ نے مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں مُدَرّسی کی خدمت حاصل کی اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اسی زمانہ میں آپ کو خیال پیدا ہوا کہ مشکل درسی کتب کی شرح کی جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں آپ نے (**نامی، شرحِ حسامی**) عربی زبان میں لکھی، جس کو اساتذہ نے بہت ہی پسند کیا اور درس میں شامل کر لیا، جو تا این دم عربی مدارس کے درس میں، حتیٰ کہ جامع ازہر مصر میں بھی پڑھائی جاتی ہے، اور ہزارہا کی تعداد میں مصر سے طبع ہوئی ہے۔

اسی سال کے آخر میں آپ مدرسہ فتح پوری کی مدرسی سے مستعفی ہو گئے اور مکان ہی پر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کر دیا۔ صبح کو درسِ حدیث کے بعد تالیف و تصنیف اور استفتاؤں کے جوابات میں زیادہ وقت صرف فرمایا کرتے تھے۔ بعد نمازِ عصر اساتذہ وتلامذۂ مدرسہ فتح پوری اور شہر کے معزز حضرات تشریف لاتے تھے اور مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

یہ سلسلہ عشاء تک جاری رہتا، اس دور کے علمائے علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ طریقت کے بھی غوّاص ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کمترین کو اس عہد کے جن علماء کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ سب محدّث، عالمِ شریعت اور صاحبِ طریقت تھے۔ چنانچہ مولانا یونس علی صاحب بدایونیؒ، مولوی تجمّل حسین صاحب نقشبندی بہاریؒ، مولانا عبد الحق صاحب قادری جہانگیرویؒ، مولانا عبد الرشید صاحب ابن مولانا عبد الحکیم صاحبؒ، بانی مدرسہ نعمانیہ دہلی، مولانا شاہ اخوند محمد عمر قادری دہلویؒ، شاہ ابو الخیر صاحب نقشبندیؒ ... ...[6] وغیرہ کو میں نے دیکھا ہے۔

یہ وہ بزرگ ہستیاں تھیں جو فاضلِ اجل ہونے کے علاوہ اعلیٰ پایہ کے صاحبِ سلسلہ اور پیرِ طریقت بھی تھے۔ جن کے فیوض و برکات سے لاکھوں مسلمانوں فیضیاب ہوئے ہیں۔ ان بزرگوں کی زیارت کا شرف مجھے حقّانی منزل ہی میں ہوا ہے۔ مولانا حقّانیؒ کے تبحرِ علمی اور آپ کی خداداد ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے اس عہد کے علماء میں آپ کا ایک خاص وقار تھا۔

[ایک شیعہ مجتہد کی فتنہ انگیزی] گلی قاسم جان دہلی میں ایک بہت بڑی حویلی تھی، جو ڈپٹی ہادی حسین خان کے نام سے موسوم تھی۔ یہاں محرّم الحرام میں تیرہ دن تک مجالس ہوتی تھیں، جن میں علاوہ شیعہ حضرات کے اہلِ سنت والجماعت بھی بکثرت شریک ہوتے تھے۔

---

[6] اصل میں اس طرح کا بیاض ہے۔

اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ لکھنؤ سے ایک نو عمر مجتہد صاحب تشریف لائے۔ تقریر نہایت سلیس اور لچھے دار کرتے تھے اور اشعار بھی خاص انداز میں پڑھتے تھے، لیکن اپنی تقریروں میں صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم پر سب و شتم بھی کر جاتے تھے۔ ان مجتہد صاحب نے دعوی کیا کہ جو قرآنِ مجید حضرت نبیِ کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا موجودہ قرآنِ مجید وہ نہیں ہے، بلکہ ابو بکرؓ کا تحریف کردہ قرآنِ مجید ہے، جن میں آیات کو مقدّم موخّر کر کے تحریف کی گئی ہے۔ اصل قرآنِ مجید مولائے علیؓ نے ابو بکرؓ کے سامنے پیش کیا تھا جو کاتبِ وحیِ خاص تھے، ابو بکرؓ نے وہ قرآنِ مجید لینے سے انکار کر دیا تو حضرت یہ فرماتے ہوئے اس قرآنِ مجید کو لے کر چلے گئے کہ اب یہ قرآنِ مجید تم کو قیامت تک نہ ملے گا۔

یہ سنتے ہی لوگوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک اٹھی اور جھگڑا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام شہر میں یہ آگ بھڑک گئی۔ سخت فساد کا اندیشہ ہو گیا۔ مولانا حقّانیؒ نے پنجاب سے کچھ شیعہ مجتہدین کو بلایا، جن میں سید علی الحائری بھی تھے۔ انہوں نے متفقہ طور پر ایک بیان میں شائع کیا جس میں اعلان کیا کہ شیعوں کا ہرگز یہ عقیدہ نہیں ہے، بلکہ وہ موجودہ قرآنِ مجید کو وہ ہی اصلی قرآنِ مجید مانتے ہیں جو نبیِ کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا، جس میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔

ابھی پورے طور پر یہ فتنہ دبا نہ تھا کہ مرزا حیرت مرحوم نے خروج کیا اور اپنے اخبار کَرْزَن گزِٹ (Curzon Gazette)[7] میں مضامین لکھنے شروع کر دیئے کہ واقعۂ کربلا غلط ہے اور امام حسینؓ شہید نہیں ہوئے، یزید بن معاویہ مسلمانوں کے صحیح اور مسلّمہ خلیفہ تھے، اور اس کا کردار صحابہؓ کے کردار سے کسی طرح کم نہ تھا۔ امام حسینؓ نے خروج کیا تھا جس کی شرعی سزا ان کو مل گئی، اور وہی دلائل پیش کئے گئے تھے جو

[7] شائقین اس کے شمارے ریختہ ویب سائٹ پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

آج کل محمود احمد عباسی نے اپنی کتاب (**خلافتِ معاویہ ویزید**) میں پیش کئے ہیں، جن کو تاریخ کے نام نہاد ریسرچ کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ شاید عباسی صاحب کو کرزن گزٹ کے وہ ہی پرچے مل گئے ہیں جن کو دیکھ کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

الغرض مرزا صاحب کے اس خروج سے مسلمانانِ ہند میں عمومًا اور مسلمانانِ دہلی میں خصوصًا سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس موقع پر بھی مولانا حقّانیؒ نے جو کردار ادا کیا وہ یہ تھا کہ مرزا حیرت کو نجی طور پر بلا کر سمجھایا کہ آپ اس سلسلہ کو بند کر دیں، آپ کا خیال غلط ہے، آپ نے مسئلۂ شہادت کو نہایت مختصر الفاظ میں مرزا صاحب کے سامنے بیان کیا۔

مجھے یاد ہے مرزا صاحب مرحوم نے جوابًا کہا کہ میرا عقیدہ یہ نہیں، بلکہ میں تو دیکھتا ہوں کہ شیعہ صاحبان جو صحابۂ کبارؓ کی ذات پر رکیک اور بے بنیاد الزامات لگانے کے عادی ہو گئے ہیں، وہ شہادت امام حسینؓ کو کیونکر ثابت کرتے ہیں؟

مولانا حقّانیؒ نے مجبور کیا کہ وہ اس سلسلہ کو بند کر دیں اور بیان بذریعۂ اشتہار جاری کیا کہ مرزا حیرت صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کا عقیدہ نہیں، بلکہ ایک ناعاقبت اندیش اور نام نہاد مجتہد اور جاہل شیعہ کی اشتعال انگیزوں کا نتیجہ ہے۔

[تالیفات اور تصنیفات] مولانا حقّانیؒ کی بہت ساری تصنیفات ہیں، جن میں سے خاص خاص کا ذکر کروں گا۔

نامی شرح حسامی تا این دم عربی مدارس کے درس میں شامل ہے۔ اس کے بعد امام المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف حجۃ اللہ البالغۃ کی شرح **حجۃ اللہ** ...[8] لکھی، جس کو علمائے ہند نے استحسان کی نظر سے دیکھا۔

ما بعد اسکولوں کی تعلیم کو دیکھتے ہوئے (جس کو آپ پسند نہیں فرمایا کرتے تھے) کہ یہ تعلیم مسلمان بچوں کو اسلام سے بیگانہ بنا دیگی، دہریت اور الحاد پیدا کر دیگی، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگوں کو کبھی ایک دن کے لئے بھی سرکاری اسکولوں میں نہیں بھیجا اور مخالفینِ اسلام کی دریدہ دہنی کا خیال فرماتے ہوئے آپ نے علم الکلام میں **عقائد الاسلام** کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی۔ یہ کتاب ۳؍ ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۱ھ کو لکھنی شروع کی اور ۴؍ ربیع الاول سنہ ۱۲۹۲ھ کو اس قطعۂ تاریخ پر ختم ہوئی ؎

چون درین روزھا بفضلِ خدا — یافت این نسخہ صورتِ اتمام
داشتم فکر سال آن کہ کیسے — گفت با من تمام گشت کلام
(۱۲۹۲ھ)

اس کتاب کو مسلمانوں کے ہر طبقہ میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا گیا اور طبقۂ علماء میں جو مقبولیت ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ استاد العلماء، محدّث ومفسّر، بانئ مدرسۂ دیوبند، حضرت مولانا و شیخنا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ تعالی نے اس کتاب کی تعریف میں حسبِ ذیل الفاظ تحریر فرمائے:

اردو میں یہ کتابِ لاجواب میں نے اول سے آخر تک دیکھی۔ سچ یہ ہے کہ ایسی کتاب اس زبان میں نہ پہلے دیکھی، نہ سنی۔ مضمون کی خوبی مصنف کے کمال کی دلیل ہے، اور کیوں نہ ہو؟ یُعرف الرجال بالمقال۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔ دیکھنے والے خود دیکھ لیں گے کہ یہ کتاب کیسی ہے۔ ۱۲

[8] یہاں پر بھی اصل متن میں بیاض ہے۔

اس زمانے میں سر سیّد احمد خان صاحب کی تفسیر القرآن شائع ہوئی، جس میں دوزخ جنت ملائکہ وغیرہ کی وہ تاویلات پیش کی گئیں جن سے قرآن کا مفہوم ہی بدل گیا۔ اس تفسیر کی اشاعت سے مسلمانوں میں ایک ہیجان سا پیدا ہو گیا، بالخصوص طبقۂ علماء میں غم و غصہ کے جذبات بھڑک گئے۔

اس تفسیر کا اندازہ اِس زمانہ میں پرویز صاحب کی تصنیفات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ دہلی کے علماء خصوصًا تلامذۂ مدرسہ عربیہ فتح پوری "حقّانی منزل" میں جمع ہوئے اور درخواست کی کہ اس کا جواب آپ لکھیں۔ آپ نے اس کے جواب میں دو سو (۲۰۰) صفحات پر ایک کتاب لکھی جو بعد میں (**مقدمۂ تفسیرِ حقّانی**) کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس میں سر سیّد مرحوم کی لغزشوں کی اصلاح کے ساتھ ساتھ مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کے عقلی و نقلی دلائل سے جوابات دیئے گئے تھے۔ چنانچہ یہ کتاب طبع ہو کر اشاعت پذیر ہوئی جسے طبقۂ علماء نے بے حد پسند فرمایا، اس کے بعد آپ نے (**تفسیرِ حقّانی**) کی تالیف پر توجہ دی، جو تقریبًا دو سال میں مکمل ہوئی، یہ تفسیر بڑے سائز پر آٹھ جلدوں میں لکھی گئی۔

تفسیرِ حقّانی اردو زبان میں سب سے پہلی تفسیر ہے جو مخالفین کے اعتراضات کو سامنے رکھ کر لکھی گئی، ترجمۂ قرآن عام فہم سلیس اردو میں ہے جس کو خاص و عام آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی صرفی و نحوی ترکیب بھی دی گئی ہے، تاکہ ترجمہ کرنے میں کسی کو مغالطہ نہ ہو۔ پھر تفسیر القرآن جس میں مخالفینِ اسلام کے مسکت اور دندان شکن جواب عقلی و نقلی دلائل سے دیئے گئے ہیں، تفسیرِ حقّانی کی اشاعت کے بعد آپ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ یہ تفسیر طبقۂ علماء میں بے حد مقبول ہوئی۔

[حیدآباد طلبی اور اجراءِ منصب] تفسیرِ حقّانی کی اشاعت کے بعد ہی آپ کو اعلٰی حضرت میر محبوب علی خانؒ، خسروِ دکن، نے حیدر آباد مدعو فرمایا۔ مولانا نے تفسیر نذر کی جسے اعلٰی حضرت نے کھڑے ہو کر سر پر لیا۔ مولانا حقّانیؒ کو کئی ماہ تک سرکاری مہمان رکھا، خلعتِ خاصہ اور دو سو تیس (۲۳۰) روپیہ ماہوار منصب سے سرفراز فرمایا۔

دہلی آنے کے بعد آپ نے مقدمۂ ثانی تفسیرِ حقّانی (**البیان فی علوم القرآن**) تقریبًا چھ صد صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی، جو طبقۂ علماء بالخصوص انگریزی دان حضرات میں بیت زیادہ مقبول ہوئی۔

مولانا شفقت اللہ بدایونیؒ نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا جو تھیکر کمپنی (Thacker, Spink & Co.) کلکتہ میں طبع ہو کر شائع ہوا اور یورپ میں بہت مقبول ہوا۔[9]

اس کے بعد بھی آپ درس و تدریس کے ساتھ تصنیفات میں مشغول رہے۔ چنانچہ چھوٹی بڑی یک صد کے قریب تصانیف ہیں۔

ردِ آریہ اور ردِ نصاری میں بہت سے رسائل تصنیف فرمائے۔ ردِ آریہ میں (**احقاقِ حق**) اور (**شہابِ ثاقب**) وہ رسائل ہیں جن کے جوابات کے لئے مولانا حقّانیؒ نے دو ہزار

---

[9] کتاب کی تفصیلات حسبِ ذیل ہے:

An Introduction to the commentary on the Holy Qoran: being an English translation of al Bayan, by Maulvi Aboo Muhammad Abdul Haqq Haqqani of Delhi. Trans. Muhammaed Shafqat Ullah of Budaon. (Calcutta: Thacker, Spink & Company) (1910).

اس لنک پر دیکھئے:

https://www.worldcat.org/title/introduction-to-the-commentary-on-the-holy-qoran-being-an-english-translation-of-al-bayan/oclc/84499039?referer=di&ht=edition

کتاب کی دو بارہ طباعت واشاعت سنہ ۱۹۷۵ء مکتبہ اوریئنٹل امرینٹس، لاہور کی طرف سے ہوئی ہے۔ (Oriental Imprints: Lahore)۔

روپیہ انعام دینے کا اعلان کیا تھا، لیکن فرقۂ آریہ کی طرف سے اس کا اب تک کوئی جواب نہیں لکھا گیا۔ انجمن ہدایت الاسلام دہلی اور جمعیت مرکزیہ تبلیغ الاسلام انبالہ نے ان کو متعدد مرتبہ طبع کرا کر شائع کیا ہے۔

[مناظرہ] مولانا حقّانیؒ کو فنِ مناظرہ میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ اگر آپ کو امام المناظرین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ میرے استاد مولانا جان محمد عارفؒ جو تیس (۳۰) سال تک آپ کی خدمت میں رہے ہیں، اپنی کشکول میں لکھتے ہیں کہ جو کمال میں نے مناظروں میں مولانا حقّانی میں دیکھا ہے وہ کسی مناظر میں نہیں دیکھا گیا۔

بیشتر مناظرین اپنے مخالف پر اثر اور رعب جمانے کے لئے خشمگیں صورت بنا کر پھبتیاں کستے ہیں اور تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن مولانا ممدوح اپنے مخاطب سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ انسانیت اور تہذیب سے گفتگو کرتے تھے۔ کیا مجال کہ کوئی فقرہ خلافِ تہذیب زبان سے نکلے؟ سچ ہے (**الحق یعلو، ولا یعلی علیہ**)۔

میں متعدد مناظروں میں ساتھ رہا ہوں، میں نے کوئی مناظرہ ایسا نہیں دیکھا کہ جس میں اس وکیلِ اسلام کو شکست ہوئی ہو یا مخالف نے آپ کے اخلاق اور قابلیت کا اعتراف نہ کیا ہو۔

چنانچہ سنہ ۱۳۰۷ھ میں ایک مناظرہ مرشدآباد بنگال میں مابین اہلِ حدیث و اہلِ فقہ بہت بڑے پیمانہ پر منعقد ہوا، جس میں ہندوستان بھر کے علماء اور رؤساء کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ مناظرہ کا فیصلہ کرنے کے لئے ہائی کورٹ کلکتہ کے دو وکیل اور ایک جج حَکَمْ منتخب کئے گئے تھے۔ اس مناظرہ کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں علماء اپنے وعظوں میں اختلافیہ مسائل زیادہ بیان کرتے تھے، جو عوام کی فہم سے بالاتر ہونے کی وجہ سے جھگڑے، فتنہ و فساد، بلکہ عدالتوں میں مقدمات تک کی نوبت آرہی تھی، جس کی وجہ سے سنجیدہ مسلمانوں کا طبقہ بہت پریشان تھا۔

بنگال کے بعض رؤساء نے خیال کیا کہ ان اختلافیہ مسائل کا فیصلہ کیوں نہ ایک مناظرہ کے ذریعہ کرا لیا جائے؟ تاکہ یہ اختلافات دور ہو جائیں۔ چنانچہ راجہ ظل الرحمن صاحبؒ، رئیسِ طالب پور بنگال، نے مرشدآباد میں ایک مناظرہ کا اہتمام کیا۔ مولوی ابراہیم صاحبؒ اہلِ حدیث مع ایک بڑی جماعت علمائے اہلِ حدیث کے مرشدآباد پہنچ گئے۔

ہزارہا کی تعداد میں اطراف و اکنافِ ہند سے مسلمان پہنچ گئے۔ مقابلے کے لئے مولوی عبد الحقؒ صاحب، اہلِ فقہ بنگال، مع مولوی احسان علیؒ و مولوی سعید الدین صاحبؒ مدرّس مدرسۂ عالیہ کلکتہ بھی مرشدآباد پہنچ گئے۔ سامعین کے اجتماع کا اندازہ پندرہ ہزار کیا گیا تھا، کئی روز تک مناظرہ ہوتا رہا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

اہلِ حدیث حضرات نے دہلی سے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحبؒ کو شرکت کی دعوت دی، مگر مولانا ممدوح نے مناظرہ کی شرکت سے انکار فرما دیا۔ علمائے احناف نے مولانا حقّانیؒ کو مدعو کیا۔ مولانا کچھ علیل تھے، اس لئے آپ نے بھی اپنی معذوری کا اظہار کر دیا، آخر مولانا ہدایت الرسولؒ اور مولانا سعید الدینؒ صاحبان دہلی آئے اور مولاناؒ کو مجبور کر کے مرشدآباد لے گئے۔

یہ خادم اور مولانا عبد الرشید نعمانیؒ ہمرکاب تھے۔ یہ مناظرہ ایک بڑے پنڈال میں ہو رہا تھا۔ مولانا حقّانیؒ کے پہنچنے پر خوشی اور مسرّت کے نعرے بلند ہو گئے۔ مولانا حقّانیؒ نے کھڑے ہوتے ہی فرمایا کہ میں ابھی آیا ہوں، مجھے علم نہیں کہ بحث کا موضوع کیا ہے، اور کون کون سے مسائل زیرِ بحث ہیں جن کو مجھے ثابت کرنا ہے۔ میں ثالث حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ اس پر روشنی ڈالیں تاکہ اسی کے مطابق گفتگو کی جاسکے۔

ثالثوں میں سے جَجْ صاحب نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ بحث کچھ ایسے طریقہ پر ہو رہی ہے کہ جس کو ہم اب تک پورے طور پر سمجھ ہی نہیں سکے، لہذا آپ ہی فریقین سے مشورہ کے بعد بحث کا موضوع قرار دے لیں اور مسائل قلمبند کرا دیں جن پر بحث کرنی ہے تاکہ ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔

مولانا نے فرمایا اگر آپ حضرات مقرّرہ وقت سے علاوہ دس منٹ دے دیں تو میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں۔ چنانچہ وقت دیا گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم دونوں فریق مسلمان ہیں، (**اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول**) ہم دونوں کا ایمان ہے، ہمارا ایک قرآن اور ایک رسول ہے، اصولِ اسلام: نماز، روزہ، حج، زکوۃ کو ہم دونوں فرض سمجھتے ہیں، اس لئے ہم میں کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ صرف ایک چھوٹے سے مسئلے پر اختلاف ہے جس کی وجہ سے یہ اختلافیہ مسائل پیدا ہوتے ہیں اور وہ ہے **تقلیدِ شخصی**۔

اگر اس مسئلہ پر ہم متفق ہو جائیں تو جملہ مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں، پھر ہم میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ میں اپنے فاضل مخاطب سے دریافت کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟

مولانا ابراہیم صاحب بنگالیؒ نے فرمایا کہ مولانا حقّانیؒ نے جو کچھ فرمایا وہ بالکل درست ہے، اصل جھگڑے کا باعث تقلیدِ شخصی ہے۔ اس پر حکم صاحبان نے کہا کہ پھر اسی مسئلہ پر کیوں نہ بحث ہو جائے، تاکہ یہ جھگڑے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں؟

اس پر فریقِ ثانی کی طرف سے آوازیں اُٹھیں کہ تقلیدِ شخصی کسی طرح ثابت نہیں ہوسکتی۔ اس پر مولانا حقّانیؒ نے فرمایا کہ میں ان شاء اللہ تقلیدِ شخصی ہی کو ثابت کروں گا۔ میرا دعوٰی ہے کہ بغیر تقلیدِ شخصی دنیوی و دینی کوئی کام درست ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ تقلیدِ شخصی پر بحث شروع ہوئی، مولانا حقّانیؒ نے دو گھنٹے کی بحث میں تقلیدِ شخصی کو اس خوبی سے ثابت کیا کہ ثالثوں نے بے ساختہ تحسین و

آفریں کے نعرے بلند کئے اور اعلان کیا کہ حقیقتًا بغیر تقلیدِ شخصی کے چارۂ کار نہیں، مولانا حقّانیؒ نے اس کو ثابت کر دیا ہے۔ جان محمد عارفؔ۔[10]

[حمیتِ اسلام اور تبلیغی خدمات] ذاتِ باری نے مولانا حقّانیؒ کی رگ رگ میں حمیتِ اسلامی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ اوائلِ عمر ہی سے آپ زندگی کے ہر شعبہ کو اسلامی زاویۂ نظر سے دیکھتے تھے، تبلیغ اور اشاعتِ اسلام سے آپ کو خاص شفقت[11] تھی، یہی وجہ تھی کہ آپ نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تبلیغی شعبہ قائم کرنے پر زور دیا تھا۔[12] جب کبھی اعدائے اسلام نے اسلام کے مقدّس و منوّر چہرے کو اپنے بیہودہ اور لغو اعتراضات سے گرد آلود کرنا چاہا آپ سینہ سپر ہو گئے اور دندان شکن جواب دیئے کہ اس کو راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔

سنہ ۱۸۰۰ء کا آخری دور مسلمانوں کے لئے ایسا نا مساعد دور تھا کہ انگریزی حکومت ہندوؤں سے تو کچھ زیادہ خائف نہ تھی، مگر مسلمانوں کو ہر وقت خطرے کی نظر سے دیکھتی تھی، گو حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت سید احمدؒ کا عَلَمِ جہاد سکھوں کے خلاف تھا مگر مسلمانوں کے جوشِ جہاد کو حکومت نے بغور دیکھا تھا، اس لئے وہ یہ چاہتی تھی کہ انہیں اس قدر دبا دیا جائے کہ یہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔

جا بجا عیسائی مشن کھولے گئے، عیسائی مشنریوں کو خفیہ ہدایت تھی کہ مسلمانوں کو جس طرح بھی ہو زیادہ سے زیادہ عیسائی بنایا جائے۔ مسلمان عورتوں کو بے پردہ اور آزاد ہونے کی ترغیب اور تعریض دلا کر عیسائی بنایا جائے۔ چنانچہ دہلی میں نجیب

---

[10] یعنی یہ مناظرہ کے ذیلی عنوان کے شروع میں مولانا محمد عارف کے کشکول سے جو ذاتی مشاہدات کا اقتباس شروع کیا ہے وہ یہاں پر ختم ہوتا ہے۔ سو جہاں مناظرۂ مرشدآباد کی شرکت و حاضری کے تعلق سے یہ لکھا ہے (یہ خادم اور مولانا عبد الرشید نعمانیؒ ہمرکاب تھے) اس میں (خادم) سے مراد مولانا محمد جان صاحب ہیں، نہ کہ مضمون نگار حکیم محمد اسحاق صاحب۔ خوب سمجھ لیں۔

[11] اصل میں شفقت ہے، گو یہاں اس کے بجائے (شغف) زیادہ موزوں معلوم پڑتا ہے۔

[12] ندوہ میں یہ شعبہ (شعبۂ دعوت وارشاد) کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں یہ شعبہ میرے عزیز و محسن استاد مولانا عبد السلام خطیب بھٹکلی نفعنا اللہ بعلومہ ومتعنا بطول صحبتہ کے ذمہ تھا، جو میرے ہاسٹل کے مشفق نگراں بھی تھے۔ ان ہی کے ذریعہ سے شعبہ کے تعارف کے علاوہ چند بار اس کی زیارت نصیب ہوئی۔ پتہ نہیں اس کا اب کیا کیا حال ہے مگر اس مضمون اور حالات حاضرہ کے تناظر میں بظاہر نئے خون اور نشاط کی ضرورت ہے۔ واللہ اعلم۔

الدولہ کی حویلی میں جو بارہ دری نواب وزیر کے متصل نہرِ سعادت خان کے کنارے پر تھی مشن قائم ہوا۔

عیسائی عورتیں تعلیم دینے اور بچوں کے علاج معالجے کے حیلے سے مسلمان گھروں میں جاتی تھیں اور بھولی بھالی لڑکیوں کو اغوا کر کے مشن لے جاتی تھیں۔ ادھر عیسائی مبلّغ مسجدِ فتح پوری کے سامنے نہر کی پٹری پر کوچہ نٹواں کے مقابل گھنٹہ گھر کے نیچے اور فوارہ پر کھڑے ہو کر علی الاعلان اسلام پر رکیک حملے کرتے تھے۔ اگر کوئی مسلمان مقابلہ پر آتا تھا تو وہ پولیس کے شکنجے میں کسا جاتا تھا۔

کئی مسلمان خاندان عیسائی ہوگئے، جن میں عماد الدین[13] اور احمد مسیح بھی تھے کو پادری کے لقب سے مشہور ہوئے۔ انہی کے ذریعہ اسلام سے نا واقف مسلمانوں کو گمراہ کیا جاتا تھا۔ دہلی کے ایک معزز خاندان کی دو لڑکیاں اغوا ہو کر مشن پہنچ گئیں، جس سے مسلمانوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔

اس وقت مولانا حقّانیؒ نے شہر کے معزّز اور ذی ہوش مسلمانوں کو مدعو کر کے اس فتنہ کے سدِ باب کی طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ ایک وفد حافظ عزیز الدین وکیل مرحوم کی سرکردگی میں (جن کے نام سے کوچہ پنڈت دہلی میں گلی عزیز الدین ہے) گورنرِ پنجاب کے پاس پہنچا، اُدھر مسلمانوں میں یہ تحریک چلائی کہ عیسائی عورتوں کو اپنے گھروں میں نہ آنے دیں، اُسی دور میں کچھ غیور مسلمان ایک دم مشن میں گھس گئے اور کئی لڑکیوں کو زبردستی نکال لائے۔ پولیس نے بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر کے بڑی سختی کی۔

مولاناؒ نے ایک جماعت بنائی تاکہ ان بے گناہ مسلمانوں کے مقدمات کی پیروی کرے اور کچھ مسلمان ایسے تیار کئے جو عیسائی مبلغوں کی تقریروں میں رکاوٹ ڈالتے۔

---

[13] اصل میں یہاں (عماصر الدین) ہے۔ یہ غالبا عماد الدین کی تصحیف ہے۔ پادری عماد الدین لاہز اس کے وقت کے مشاہیر میں سے تھے، ان کی سنہ وفات سنہ ۱۹۰۰ء ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو اپنی پالیسی بدلنا پڑی۔ سب مسلمان رہا کر دیئے گئے اور عیسائی عورتوں کو حکومت کی طرف سے یہ ہدایت ہو گئی کہ جب تک مسلمان ان کو طلب نہ کریں، ان کے گھروں میں نہ جائیں۔

ابھی یہ عیسائی فتنہ پورے طور پر دبا نہیں تھا کہ ہندوؤں میں سوامی دیانند (Swami Dayanand Saraswati) پیدا ہو گئے۔ پہلے دیانند جی نے سناتن دھرمیوں کو آریہ بنانے کی کوشش کی۔ جب ان کو قدیم ہندوؤں میں کامیابی نہ ہوئی بلکہ قدیم ہندو ان کے دشمن ہو گئے تو آریوں کو مایوس ہو کر سوچنا پڑا کہ ہندوؤں میں مقبول ہونے کے لئے کیا قدم اٹھایا جائے؟ چنانچہ دیانند کی کتاب (**ستیارتھ پرکاش**) میں چودھویں باب کا اضافہ کیا گیا، جس میں اسلام اور حضور رسولِ کریم ﷺ پر رکیک حملے کئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی دل جلے نے امرتسر میں سوامی دیانند کے جانشین لیکھ رام (Pandit Lekh Ram) کو قتل کر دیا۔

جس روز لیکھ رام کا قتل ہوا مجھے یاد ہے رات کو بارہ بجے کے قریب (حقّانی منزل) میں پولیس آگئی اور مولانا حقّانیؒ کے خاص کمرے کو سر بمہر کر دیا گیا۔ دوسرے روز معلوم ہوا کہ حافظ عزیز الدین وکیلؒ، مولوی امو جانؒ اور حافظ عبد العزیزؒ سوداگرِ چرم کے یہاں بھی پولیس نے انتہائی کوشش کی کہ سازش کا الزام لگا کر ان تینوں بزرگوں کو گرفتار کرے، مگر بحمد اللہ کہ پولیس کی تلاشی میں ان حضرات کے ہاں سے کوئی چیز ایسی برآمد نہیں ہوئی جس کی بنا پر ہاتھ ڈالا جاتا۔

لیکھ رام کے قتل کے بعد آریوں نے یہ طے کیا کہ قدیم ہندوؤں کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے خلاف مہم چلائی جائے، تاکہ بجائے آریہ مسلم سوال کے ہندو مسلم سوال پیدا ہو جائے۔ اس قرارداد کے بعد اسلام کے خلاف تحریراً و تقریراً لاف و گذاف شروع ہو گیا۔

چنانچہ گروکل کانکڑے (Gurukula Kangri)[14] کا ایک پنڈت جو شرما جی کے نام سے پکارا جاتا تھا دہلی آیا اور اسلام پر سخت حملے شروع کر دیئے، جس سے ہندو مسلم فساد کا اندیشہ ہو گیا۔ حکومت کو توجہ دلائی گئی۔ حکومت نے تین گھنٹے کے نوٹس سے اس کو دہلی سے نکال دیا۔ اب ایک بڑی جماعت آریوں کی ریاست بھرت پور، متھرا، وغیرہ اضلاع میں پھیل گئی، تاکہ ملکانہ راجپوتوں کو مرتد بنایا جائے۔

ملکانہ راجپوتوں کو اس لئے سب سے پہلے نشانہ بنایا گیا کہ وہ اسلام سے قطعی واقف نہ تھے، صرف نام کے مسلمان تھے جو گنیش محمد اور رام خان جیسے نام رکھتے تھے۔ پہلے قاضی نکاح کراتا تھا، پھر برہمن پھیرے کراتا تھا۔ مرنے کے بعد ختنہ کرتے اور منہ جُھلس کر دفن کرتے۔ بجائے مسلمانوں کے اپنے آپ کو آدھ بہریا[15] کہتے تھے، یعنی نصف ہندو نصف مسلمان، جو بھرت پور، آگرہ، مُتھرا وغیرہ اضلاع میں چھ لاکھ سے زائد تعداد میں آباد ہیں۔

سب سے پہلا محاذ آریوں نے ڈیک (Deeg)[16] ریاستِ بھرت پور کو بنایا، راجہ بھرت پور کی امداد بھی حاصل کر لی۔ مولانا کو جب یہ علم ہوا تو مولوی محمد حسین کنگھی والوںؒ کو جو ایک اچھے مناظر اور سماجی عالم تھے کئی اور مبلغوں کے ساتھ ریاستِ بھرت پور بھیج دیا، اور دہلی میں خاص خاص علماء اور صاحبِ درد مسلمانوں کو جمع کر کے تمام کیفیت سنا کر آریوں کے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۲۱۳ء کا ہے۔

---

[14] یہ آریہ سماج کے ایک عظیم مبلغ سوامی شرادھنند (Swami Shraddhanand) کا قائم کردہ تعلیمی ادارہ ہے، جو بعد میں باقاعدہ سرکاری یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا اور آج (Gurukul Kangri University) سے پہچانا جاتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۲ء اس کی سنہ تاسیس وبنا بتائی جاتی ہے۔ کانگڑی حَالیہ ریاستِ اتر کھنڈ اور سابقہ ریاستِ اتر پردیش، ضلع بجنور کے ایک گاؤ کا نام ہے جہاں پر اصل ادارہ تھا۔ لگ بھگ سنہ ۱۹۲۴ء کے قریب جب دریا کا رخ بدلا تو ادارہ کو قریبی شہر ہریدوار (Haridwar) منتقل کیا گیا، اور اب تک ادارہ وہیں پر ہے۔

[15] بَہُرْیَا (Bahuriyaa/bahuryaa) یہ سنسکرت الاصل لفظ ہے اور بَہُو (bahoo) کے معنی میں ہے۔

[16] ھنوز یہ طے نہیں ہو پایا کہ بجائے گاف کے اصل متن میں کاف تصحیف ہے یا یہ قدیم طرز ضبط۔

مولانا حقّانیؒ کی یہ تحریک کامیاب ہوئی اور دہلی میں مولانا حقّانیؒ کی زیرِ صدارت انجمن ہدایت الاسلام قائم ہو گئی۔

[انجمن ہدایت الاسلام، دہلی] انجمن ہدایت الاسلام کا شعبۂ مالیات دہلی کے بہت ہی باخیر بزرگ حاجی محمد اسحاق سوداگرؒ اور شیخ محمد عثمان آزادؒ، مدیرِ انجام، کے والد حاجی عبد الصمدؒ کے سپرد ہوا اور قرار پایا کہ فی الحال کم از کم پچیس (۲۵) ذی علم اور صاحبِ ایثار مبلّغ مقرر کر کے فورًا ملکانۂ راجپوتوں میں بھیجے جائیں، اور ان کو سفر کے خرچ کے علاوہ ان کے اہل و عیال کے گزارے کے لئے وظائف بھی دیئے جائیں۔

چنانچہ مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم مغفور کی خدمات دفتر کے اہتمام کے لئے حاصل کی گئیں۔ مولانا موصوف کے مشورے سے مبلغین فراہم کئے گئے، اور مبلغین کو یہ بھی ہدایت تھی کہ خاص خاص مواضع میں مکاتب بھی قائم کریں، تاکہ ملکانہ راجپوتوں کے بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے کہ وہ خود آریوں کا مقابلہ کر کے اپنی قوم کو ارتداد سے بچانے کے لئے تیار ہو سکیں۔ جا بجا ملکانوں کی پنچائتیں قائم کر کے ان کو آمادہ کر لیں، کہ آریہ ان کے گاؤں میں نہ آسکیں۔ تیسرے شعبہ میں ایسے مبلّغ رکھے گئے جو آریہ مبلغین کے مقابلہ میں جا کر مناظرہ کر سکیں۔

مولاناؒ کی تحریک پر سنہ ۱۹۰۸ء میں انجمن کی زیرِ سرپرستی ایک ہفتہ وار اخبار (**الہدایت**) جاری ہوا۔

[اخبار الہدایت] اخبار (**الہدایت**) کا اہتمام میرے سپرد تھا، اور ادارت مولوی عبد الواحد بلگرامیؒ کے سپرد۔ اس اخبار میں مخالفینِ اسلام کے جوابات کے علاوہ انجمن ہدایت الاسلام کی خدمات، مبلغین کو رپورٹوں کا خلاصہ، اور انجمن کے آمد و خرچ کا ماہوار گوشوارہ بھی شائع ہوتا تھا۔ جہاں تک میری معلومات ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سنہ ۱۹۰۸ء میں پچاس کے قریب ملکانہ دیہات میں اس انجمن کے مکاتب تھے۔

[ہدایت الاسلام، دہلی] اس انجمن کے زیرِ اہتمام آریوں سے مختلف مقامات اور دہلی میں متعدد مناظرے بھی ہوتے رہے۔ دہلی میں دو مناظرے بڑے پیمانہ پر ہوئے۔ آخری مناظرہ سوامی دیانند سرسوتی کے دوسرے جانشین سوامی درشنانند (Swami Darshnanand) سے باڑہ ہندو راؤ (Bara Hindu Rao) میں ہوا۔ اس وقت مولاناؒ کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ اس مناظرہ میں علاوہ علمائے دہلی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا معین الدین اجمیریؒ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

اس وقت انجمن کے مہتمم مولانا محمد یونس صاحبؒ، صدرِ مدرّس دار العلوم معینیہ اور خطیب شاہجہانی مسجد اجمیر شریف تھے۔

یہ مناظرہ کئی روز تک ہوتا رہا، بالآخر کلکتہ سے مولانا حقّانیؒ تشریف لائے، یوگ اور تناسخ کی بحث کو ختم کرا کر مناظرے کو اثباتِ توحید پر لے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ سوامی دیانند جی نے ستیارتھ پرکاش میں بڑے شد و مد سے دعوی کیا ہے کہ وہ مذہب آسمانی مذہب نہیں ہو سکتا جس میں توحید نہ ہو اور ویدک دھرم ہی توحیدی دھرم ہے۔ میرا دعوی ہے کہ اس وقت سوائے اسلام کے دنیا میں کوئی توحیدی مذہب نہیں ہے۔ ساتھ ہی میرا یہ دعوی ہے کہ ویدوں میں اصنام پرستی اور عناصر پرستی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چناچہ دو روز کی بحث میں مولاناؒ نے اپنے دعوی کو ثابت کر دیا۔

اس انجمن کی اہمیت کا اندازہ اس کے دفترِ مہتممین کی شخصیتوں سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ انجمن کے اہتمام کی خدمت جن ہاتھوں میں رہی وہ یہ ہیں: ۱) مولانا مفتی کفایت اللہؒ، ۲) مولانا محمد یونسؒ، صدرِ مدرّس دار العلوم معینیہ و خطیبِ اجمیر شریف، ۳) مولانا رفعت اللہ بدایونیؒ، ۴) مولانا شمس الدین شائق لاہوریؒ، وغیرہ۔

[مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مدرسی] سنہ ۱۹۱۱ء میں مولانا حقّانیؒ کو مجبور کیا گیا کہ وہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی صدرِ مُدَرّسی کی خدمت انجام دیں۔ مولانا موصوف اس وقت

زیادہ کمزور ہو گئے تھے، اس لئے آپ نے عذر و معذرت کی، مگر آخر مجبور ہو کر اس خدمت کو قبول کر لیا اور کلکتہ تشریف لے گئے۔

وہاں کی آب و ہوا نے آپ کی صحت پر بُرا اثر ڈالا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۶ء کے آخر میں علیل ہو کر دہلی تشریف لے آئے اور ۱۲؍ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۶ھ مطابق سنہ ۱۹۱۷ء اکھتر (۷۱) سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجون۔

۱۳؍ جمادی الاول کی صبح کو مولانا امین الدین، بانئ مدرسۂ امینیہ دہلی، مولانا کفایت اللہ اور مولانا کرامت اللہ خان رحمۃ اللہ علیہم نے آپ کو غسل دیا۔ تقریبًا ایک لاکھ مسلمانوں نے جنازے میں شرکت کی۔ حضرت مولانا اخوند محمد عمرؒ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور حضرت خواجہ باقی باللہ نور اللہ مرقدہ کے مزارِ اقدس کے قریب مدفون ہوئے۔

حکیم محمد اسحاق حقّانی
۲۹؍ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء